هورخے لوئیس بورخیس

ابن رشد کی سعی و تلاش

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

''اس کے خیال میں المیہ، فنِ مدح سرائی سے زیادہ کچھ نہیں...''

—ارنیست ریناں، ''ابنِ رشد،'' ۴۸ (سنہ ۱۸۶۱)[۱]

ابوالولید محمّد ابن احمد ابن رشد (اس طول طویل نام کو مختصر ہو کر محض ابن رشد بننے کے لیے پوری ایک صدی درکار تھی۔ پہلے اس نام کی قلب ماہیت Benraist میں ہوئی، بعدازآں Avenryz میں، حتّٰی کہ Aben-Rassad اور Filius Rosadis میں بھی) ''تهافت التهافة'' کے گیارھویں باب کی تصنیف میں ہمہ تن غرق تھا۔ اس میں اس نے ایرانی نژاد زاہد الغزالی، مصنف ''تهافت الفلاسفة'' کی رائے کے خلاف یہ مقدّمہ پیش کیا ہے کہ خدا صرف کائنات کے ادراکِ کلّی سے متّصف ہے، یعنی اسے صرف ان عام عوامل کا علم ہے جن کا تعلّق نوع (species) کی کلّیت سے ہے، لیکن ان عوامل کا نہیں جن کا تعلّق نوع کے افراد یا اجزا سے ہے۔ دائیں سے بائیں، ابنِ رشد ایک پُریقین دھیمے پَن کے ساتھ لکھتا رہا۔ خیالات کے جدلیاتی اظہار اور طول طویل پیراگرافوں کو ایک ناگزیر منطقی سلسلے میں پرونے کی خشک مشغولیت کے باوجود، اسے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے گھر کی گہری، فرحت بخش ٹھنڈک کا پورا احساس تھا، گویا یہ ایک عمیق احساسِ آسودگی تھا۔ قیلولے کی اس گھڑی کی گہرائیوں میں دور کہیں شیدا فاختائیں اپنی خمار سے بوجھل آواز میں غٹرغوں کر رہی تھیں اور نظروں سے اوجھل کسی بارہ دری میں فوّارے کے جھرجھر گرنے کی گنگناتی آواز ابھر رہی تھی۔ ابن رشد، جس کے اجداد عرب کے ریگستانوں سے آ کر یہاں بس گئے تھے، اس کی شریانوں میں کوئی چیز پانی کی اس روانی اور فراوانی پر اظہارِ ممنونیت سے لب ریز ہو گئی۔ دور، نیچے باغ اور چمن تھے۔ ان سے ماورا ہمہما تا ہوا دریاے وادی الکبیر موجزن تھا، اور ان سب سے پرے، قرطبہ کا محبوب شہر، جو اپنی شہرت میں قاہرہ اور بغداد سے کسی طرح بھی کم تر نہ تھا، کسی نازک لیکن پیچیدہ ساز کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف (اور یہ ابنِ رشد نے

محض سنا ہی نہیں لمسی طور پر محسوس بھی کیا) اندلس کی سرزمین اپنی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سرزمینِ اندلس جہاں بس چند اشیا ہی میسّر تھیں، لیکن جو اپنی اپنی جگہ پر قطعی اَٹل، ناگزیر، ازلی ابدی اور قائم بالذّات تھیں۔ ۲

ابن رشد کا قلم صفحے پر بڑی روانی سے چل رہا تھا۔ اس کے پیش کردہ دلائل، نا قابلِ ردّو انکار، انسجام اور پیوستگی کا نادر نمونہ تھے۔ اس کے باوجود، ایک ہلکی سی محویت نے ابن رشد کے احساسِ طمانیت اور سرخوشی کو قدرے دھندلا رکھا تھا۔ یہ فکر خود ''تھافت'' میں کسی کوتاہی کے رہ جانے کی وجہ سے نہیں تھی۔ ''تھافت'' بہ ہر حال، ایک عارضی قسم کا کارنامہ تھی اور محض ہنگامی حالات کی بنا پر تالیف کی گئی تھی؛ یہ فکر، دراصل، اسے ایک سراسر لسانی نوعیت کے مسئلے کی وجہ سے لاحق ہوئی تھی؛ اور اس مسئلے کا تعلّق اس معرکۃ الآرا تصنیف سے تھا جو فی الواقع نوعِ انسانی کی نظر میں اس کی صحیح قدر و قیمت کی بڑی سے بڑی یادگار بننے والی تھی، یعنی ارسطو پر اس کی شرح۔ اہلِ یونان حکمت کا سرچشمہ تھے۔ انھیں گویا تحفتاً انسانیت کو پیش کیا گیا تھا تاکہ نوعِ بشر کو وہ تمام چیزیں سکھا سکیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ ابن رشد کا رفیع الشان مقصد یہ تھا کہ وہ ارسطو کی تصانیف پر اسی عرق ریزی، باریک بینی، اور نکتہ رسی کے ساتھ شرح لکھے جس کے ساتھ علما قرآن کی تفسیر لکھا کرتے ہیں۔ تاریخ میں کم ہی ایسے کارناموں کی مثال ملتی ہے جو اپنے حسن اور رقّت میں اس عقیدت کے حریف بن سکیں جو اس عربی النّسل حکیم [ابن رشد] کو ایک ایسے شخص [ارسطو] کے خیالات سے تھی جس کے اور اس کے درمیان پوری چودہ صدیوں کا فاصلہ حائل تھا۔ نفسِ مضمون کی دشواریوں کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابن رشد سُریانی زبان سے واقف تھا اور نہ اصل یونانی زبان سے۔ اصل رہی ایک طرف، اس کے سامنے تو ترجمے کا ترجمہ تھا۔ گذشتہ شام ''بوطیقا'' کے اولین حصے میں اس کا سامنا دو ایسے الفاظ سے ہوا جو خاصے مبہم واقع ہوے تھے اور جنھوں نے اسے کافی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ یہ الفاظ ''المیہ'' (tragedy) اور ''طربیہ'' (comedy) تھے۔ کئی سال ہوے اس کا ان سے *Rhetoric* کی تیسری کتاب میں سابقہ پڑ چکا تھا۔ تمام سرزمینِ اسلام میں کہیں کوئی بھی ان لفظوں کے درست معنا کے تعیّن میں اس کی مدد نہ کر سکا۔ ابن رشد نے، اسکندر الافرودیسی کی ورق گردانی بھی کی مگر لا حاصل۔ نسطوری حکما حنین ابن اسحٰق اور ابو بشر متّیٰ کے تراجم کا تقابلی مطالعہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ دونوں پُراسرار الفاظ ''بوطیقا'' کے متن میں ہمہماتے رہے، اور ان سے دامن بچا کر نکلنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ ۳

ابن رشد نے تنگ آ کر قلم ایک طرف رکھ دیا اور یقین سے عاری انداز میں اپنے آپ سے کہا کہ ہر وہ چیز جس کے ہم متلاشی ہوں، کہیں آس پاس ہی موجود ہوتی ہے۔ چناں چہ ابنِ رشد نے ''تھافت'' کے مسودّے کو ایک طرف ڈالا اور اٹھ کر کتابوں کی الماری کے پاس جا نکلا جہاں نابینا مصنف ابنِ سِیدہ کی ''محکم'' کی جلدیں، جنھیں ایرانی خطّاط نے نقل کیا تھا، ایک قطار میں ترتیب وار رکھی تھیں۔ یہ خیال ہی سرے سے بیہودہ تھا کہ آج سے پہلے اس نے اس سلسلے میں کبھی ''محکم'' سے

رجوع کیا ہی نہ ہو۔ پھر بھی دل بہلانے کے لیے اس کی ورق گردانی کی شدید خواہش کا مقابلہ نہ کر سکا، اور از سرِ نو اسے جستہ جستہ دیکھنے لگا۔ دریں اثنا، باہر سے آتی ہوئی کسی دھن کی نغمگی اس کی اس بڑی شعوری طور پر طاری کردہ مشغولیت میں حارج ہوئی اور اس کی توجّہ کا رخ پھیر دیا۔ ابن رشد نے شہ نشین کے حفاظتی جنگلے سے نیچے نظر ڈالی جہاں تنگ سے صحنچے میں چند نیم برہنہ بچّے کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک، دوسرے کے کندھوں پر چڑھا بہ ظاہر موذّن کی نقالی کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں اور وہ مترنّم آواز میں ''لا الٰہ الّا اللّٰہ'' الاپ رہا تھا۔ دوسرا لڑکا، جو پہلے کو سہارے ہوئے تھا، بالکل بے حرکت تھا، گویا کوئی مینار ہو۔ ایک تیسرا لڑکا بڑے خشوع وخضوع سے سامنے کچّی زمین پر حالتِ سجود میں تھا، گویا مومن نمازیوں کی ایک پوری جماعت کی نمایندگی کر رہا ہو۔ یہ کھیل دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ ہر لڑکا موذّن بننے کا مشتاق تو تھا، مینار اور جماعت بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر ابن رشد نے انھیں بڑی مغلّظ مقامی بولی، یعنی جزیرہ نمائے اندلس کے اَنگھڑ عامی مسلمانوں کی نئی نئی سیکھی ہوئی، بالکل مبتدیانہ ہسپانوی زبان میں تکرار کرتے ہوئے سنا۔ [۴]

ابنِ رشد نے خلیل کی ''کتاب العین'' کی جلد نکالی اور اسے کھولتے ہوئے فخر سے سوچا کہ پورے قرطبہ میں (یا بل کہ پورے اندلس میں) اس کے سوا اس بے مثال کتاب کو کوئی اور نسخہ موجود نہیں، اور یہ نسخہ خود امیر یعقوب المنصور نے اسے طنجیر سے ہدیتاً بھیجا تھا۔ بندرگاہِ طنجیر کی مناسبت سے اسے یاد آیا کہ آج شام وہ عالمِ قرآن فَرَج کے گھر پر سیّاح ابوالقاسم الاشعری کے ساتھ، جو ابھی حال ہی میں مراقش سے لوٹا تھا، کھانے پر مدعو ہے۔ ابوالقاسم مدّعی تھا کہ وہ بلادِ صین [چین] کے دور دراز علاقوں کی سیاحت کر چکا ہے۔ اس کے برخلاف، اس کے بدنام کرنے والے، نفرت کی دی ہوئی مخصوص منطق سے لیس، قسم کھانے کو تیار تھے کہ ابوالقاسم نے کبھی بھولے سے بھی ارضِ چین پر قدم نہیں رکھا، اور دوسری طرف یہ بھی کہ چین ہی کے مختلف معابد میں وہ کفر کا مرتکب ہوا ہے۔ محفل لامحالہ کئی گھنٹوں تک جاری رہے گی۔ ابن رشد فوراً پھر ''تہافت'' کی تصنیف میں مشغول ہو گیا اور شام پڑنے تک مسلسل لکھتا رہا۔ [۵]

فرج کی قیام گاہ پر گفتگو کا سلسلہ والیِ شہر کے عدیم المثال فضائل کے ذکر سے ہوتا ہوا خود والیِ شہر کے بھائی تک جا پہنچا جو امیر تھا۔ بعد ازآں، پائیں باغ میں، گفتگو گلاب کے پھولوں کے بارے میں رہی۔ ابوالقاسم، جس نے ان پھولوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا، قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اضلاعِ اندلس میں امرا کے گھروں کو مزیّن کرنے والے یہ گلاب اپنی مثال آپ ہیں، کوئی اور گلاب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فرج پر اس تعریف کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس نے بیان کیا کہ فاضل ابنِ قُتیبہ ہندوستان کے باغوں میں پائے جانے والے گلابوں کی ایک سدابہار قسم کا ذکر کر آیا ہے، جس کی خون کی طرح سرخ پنکھڑیوں پر پورے کا پورا کلمہ (لا الٰہ الّا اللّٰہ) درج ہوتا ہے۔ جملے کے آخر میں از راہِ تفنّن فرج نے یہ بھی بڑھا دیا کہ گلابوں کی اس قسم

سے ابوالقاسم تو ضرور واقف ہوگا۔ ابوالقاسم نے یک لخت خطرے کی بو سونگھتے ہوئے فرج کی طرف دیکھا: اگر وہ جواب اثبات میں دیتا ہے تو تمام مدعوین اسے ایک نہایت جلد باز بہروپیے سے زیادہ اور کیا سمجھیں گے، اور برحق سمجھیں گے؛ اور اگر نفی میں، تو کافر! آدمی چوں کہ وہ کافی زیرک تھا، اس نے یہ جملہ بڑبڑانے میں ہی عافیت سمجھی کہ تمام پُراسرار امور کی کنجی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے؛ کائنات میں کوئی چیز، رطب و یابس، ایسی نہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں پہلے سے نہ لکھ رکھی ہو؛ اور یہ بھی کہ خود یہ لفظ قرآن کی چند اوّلین سورتوں کا حصہ ہیں۔ سامعین نے یہ سب بڑی بااحترام سرسراہٹ کے ساتھ سنا۔ اس منطقیانہ فتح سے جوش میں آ کر ابوالقاسم بس اب یہ انکشاف کرنے ہی والا تھا کہ ربّ العزّت اپنے اعمال میں کامل اور بشر کے ادراک سے یک سر بالا ہے کہ معاً ابنِ رشد نے مستقبل میں آنے والے فلسفی ہیوم کا سا دقّت طلب استدلالی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے اعلان کیا:[٦]

''بھئی اس کے مقابلے میں کہ زمین سے ایسے گلاب اُگتے ہوں جن کی پنکھڑیوں پر کلمہ درج ہو، میرے لیے یہ باور کرنا زیادہ آسان ہے کہ اس معاملے میں خود ابنِ قتیبہ سے، یا اس کے کاتبین سے، فروگزاشت ہوگئی ہو۔''

''واللہ، آپ نے بالکل درست فرمایا،'' ابوالقاسم بولا۔

اس پر شاعر عبدالملک کو یکا یک کچھ یاد آ گیا، اور اس نے کہا، ''ایک سیاح نے ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے جس کے پھل کی شکل سبز چڑیوں جیسی ہوتی ہے۔ اس قسم کے درخت کا یقین کرنا میرے لیے ایسے گلاب پر یقین کرنے سے جس پر کوئی عبارت درج ہو کم دقّت طلب ہوگا۔''[٧]

''چڑیوں کے رنگ کا پھل،'' ابن رشد نے کہا، ''مانا اتنا ہی نرالا اور بعید از قیاس ہے جتنا کلمہ لکھا گلاب، اس کے باوجود، پھلوں اور چڑیوں کا تعلّق عالمِ فطرت سے ہے، جبکہ لکھنا لکھانا [خطّاطی] ایک باقاعدہ فن ہے۔ ہمارا ذہن پنکھڑیوں سے چڑیوں تک تو بہ آسانی منتقل ہوسکتا ہے، لیکن گلاب کے پھول سے حروفِ تہجّی تک اتنی آسانی کے ساتھ نہیں۔''

ایک مہمان نے غم و غصے کے ساتھ تحریر کو فن قرار دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور یہ اس بنا پر کہ اُمّ الکتاب ہونے کی حیثیت سے قرآن کی اصل خود تخلیقِ کائنات سے قدیم تر ہے، اور جنّت میں محفوظ ہے۔ ایک اور شخص نے بصرے کے جاحظ کے حوالے سے کہا کہ قرآن جوہر ہے اور جو ہر ہر قسم کی شکل میں، خواہ انسانی خواہ حیوانی، متشکّل ہوسکتا ہے۔ یہ خیال بہ ظاہر اس نظریے سے مطابقت رکھتا ہے جس کی رو سے قرآن کے دو رخ قرار دیے جاتے ہیں۔ اس پر فرج نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ راسخ عقیدے کی تفسیر پیش کی۔ اس نے کہا کہ قرآن خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے، بالکل اس طرح جس طرح رحم خدا کی ایک صفت ہے۔ قرآن کو نقل کیا جاتا ہے، اس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور اس کو حفظ کیا جاتا ہے۔ زبان، علائم، اور تحریر سب کے سب انسانی افعال ہیں، جب کہ خود قرآن ازلی اور ابدی اور ناقابلِ تنسیخ — یعنی اٹل ہے۔ ابن رشد، جو ''ریپبلک'' کی شرح لکھ چکا تھا، اس موقعے پر کہہ سکتا تھا کہ اُمّ الکتاب اپنے افلاطونی نمونے پر ڈھالی گئی ہے، لیکن اس خیال سے چپ رہا کہ ابوالقاسم

دینیات کے اَدق مسائل تک رسائی کے معاملے میں بالکل کورا ہے۔ ۸

دیگر حاضرین کا اندازہ بھی بالکل یہی تھا، چناں چہ انھوں نے ابوالقاسم سے اصرار کیا کہ وہ انھیں کوئی مُحیّر العقول کہانی سنائے۔ دنیا، خواہ جب خواہ اب، خباثت کا اڈّہ ہے۔ یہاں شوخ چشم بھی اسی آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں جس سے سبک سر—وہ لجلجے اور بدبخت جو ہر قسم کی چیز سے مفاہمت کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ ابوالقاسم کی یادداشت وہ آئینہ تھی جو قبیح اور نہایت بزدلانہ افعال کے نادرالوجود نمونوں سے اَٹا پڑا تھا۔ ان لوگوں کو وہ کون سی کہانی سنائے؟ بنابرایں، یہ لوگ بہ ضد تھے کہ وہ جو واقعہ سنائے وہ محیرالعقول بھی ہو، جب کہ واقعی محیرالعقول چیزوں کا بیان تقریباً ناممکن ہے۔ بنگال کا چاند یمن کا چاند نہیں، گو یا رلوگ دونوں کا ذکر ایک جیسے الفاظ میں کرتے ہیں۔ قدرے تامّل کے بعد ابوالقاسم یوں گویا ہوا:

''جو بھی مختلف ملکوں اور شہروں سے گزرے گا،'' ابوالقاسم نے تصنّع آمیز گرم جوشی سے اعلان کیا، ''اسے بہت سی قابلِ ذکر چیزوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوگا۔ مثلاً اب یہی واقعہ لے لیجیے، میں نے اس کو صرف ایک بار پہلے بیان کیا ہے اور وہ بھی ترکوں کے بادشاہ کے سامنے۔ یہ واقعہ مجھے کینٹون میں پیش آیا، ٹھیک جہاں دریاے آبِ حیات سمندر میں جا کر گرتا ہے۔''

فرج نے پوچھا کہ کیا یہ شہر اس دیوارِ چین سے چند میل کی مسافت پر تو واقع نہیں جسے اسکندر ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے چنوایا تھا؟

''دونوں کے بیچ طول طویل ریگ زار حائل ہیں،'' ابوالقاسم نے اضطراری گستاخی سے جواب دیا۔ ''قافلے کو اس دیوار کے میناروں کے گردونواح ہی تک پہنچنے کے لیے پورے چالیس روز درکار ہوں گے، اور مزید چالیس روز خود دیوار تک پہنچنے کے لیے۔ پورے صین کلاں [کینٹون] میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جس نے کبھی یہ دیوار دیکھی ہو، یا اگر خود نہ دیکھی ہو تو کسی ایسے شخص ہی سے واقف ہو جس نے اسے دیکھا ہو۔''

لامحدود کے خوف، مکانِ محض اور مادّۂ محض کے خوف نے لمحہ بھر کے لیے ابن رشد کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر باغ کو دیکھنے لگا جو نہایت متناسب اور سڈول تھا۔ معاً اسے احساس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے، بے مصرف، غیر حقیقی۔ ابوالقاسم کہہ رہا تھا:

''ایک دوپہر صین کلاں کے مسلمان مجھے ایک چوبی اور روغنی مکان میں لے گئے جس میں آدمیوں کا ایک جمِّ غفیر رہایش پذیر تھا۔ اس مکان کا بیان ناممکن ہے۔ مکان کیا تھا بس ایک بہت بڑا کمرا تھا جس میں حجروں اور شُرفوں کی قطاریں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ ان حجروں میں لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ یہی عمل فرش اور بالائی چبوترے پر بھی جاری تھا۔ چبوترے پر زیادہ تر لوگ طبلہ اور ستار سے ملتا جلتا کوئی ساز بجا رہے تھے۔ بقیہ، کوئی بیس کے لگ بھگ، جن کے چہرے قرمزی رنگت کے نقابوں سے ڈھکے تھے، عبادت، گانے، اور گفتگو میں مصروف تھے۔ یہ لوگ قید کی سزا بھگت رہے تھے، لیکن کمال یہ کہ قید خانے کا کہیں وجود نہ

تھا؛ گھوڑے کی سواری کر رہے تھے، لیکن گھوڑے کسی کو بھی نظر نہیں آ رہے تھے؛ معرکہ آرا تھے، مگر ہاتھوں میں تلوار کی جگہ بانس کی نرکلیں تھیں۔ یہ مر کر گر پڑتے اور پھر جست لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔''

''یہ تو بالکل پاگلوں کی سی حرکت ہوئی،'' فرج نے کہا۔ ''ذی فہم اس قسم کی حماقت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''یہ پاگل واگل بالکل نہیں تھے،'' ابوالقاسم کو مجبوراً وضاحت کرنی پڑی، ''بل کہ ایک کہانی کی تمثیل پیش کر رہے تھے۔ یہ بات مجھے ایک تاجر نے بتائی۔''

یہ بات کسی کے پلّے نہیں پڑی۔ کسی نے سرے سے سمجھنے کی خواہش یا ضرورت ہی محسوس نہیں کی، اور ابوالقاسم، بجائے بیانیے کو آگے بڑھانے کے، جھنجھلاہٹ میں، گراں بار تشریحات کا طومار باندھنے لگا۔ ہاتھوں کو استعمال کرتے ہوئے بولا:

''فرض کیجیے کوئی شخص کہانی سنانے کے بجائے کہانی دکھا رہا ہو۔ مزید فرض کیجیے کہ یہ کہانی اصحابِ کہف کے بارے میں ہے: ہم انھیں غار میں لوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر یہ کہ عبادت سے فارغ ہو کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں نیند کے عالم میں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے سوتے میں بڑھنا شروع کر دیا ہے، پھر ہم پورے تین سو نو سال بعد انھیں بیدار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ جنّت میں بیدار ہو رہے ہیں اور ان کے ساتھ ان کا کتّا بھی بیدار ہو رہا ہے۔ اور ہم یہ سب اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ بس اسی قسم کی چیز اس دوپہر چبوترے پر بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے دکھائی تھی۔''

''کیا یہ لوگ کچھ بول بال بھی رہے تھے یا بس گنگ تھے؟'' فرج نے پوچھا۔

''واہ، کیوں نہیں۔ بالکل،'' ابوالقاسم — جو چار و ناچار ایک ایسے تماشے کے وقوع کا مویّد اور ضامن بن گیا تھا جو اب اسے بہ مشکل یاد رہا تھا، اور جس نے اپنی وقوع پذیری کے وقت اسے خاصا پراگندہ ذہن بھی کیا تھا — بولا۔ ''بات بھی کی، گایا بھی، اور اختتامیہ کلام بھی کیا۔''

''اس صورت میں بیس آدمیوں کی کیا ضرورت تھی؟'' فرج نے کہا۔ ''محض ایک آدمی ہی مشکل سے مشکل اور نہایت گنجلک بات بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔''

تقریباً سبھی حاضرین نے فرج کی بات پر صاد کیا۔ اب عربی زبان کی فصاحت کے فضائل بیان کیے گئے۔ کہا گیا کہ یہ وہ زبان ہے جو خدا ملائک کو ہدایت دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بعد از آں عربی شاعری کے محاسن گنائے گئے۔ موضوع پر کافی غور و خوض کے بعد عبدالملک نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دمشق اور قرطبہ کے وہ شاعر جو اپنے کلام میں دیہاتی زندگی سے ماخوذ پیکر اور بدَوی زبان کے استعمال پر مصر ہیں، بڑے دقیانوسی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ نہایت مہمل بات ہے کہ وہ شخص جس کے سامنے دریاے وادی الکبیر اپنی تمام تر کشادگی کے ساتھ بہ رہا ہو، وہ کسی کنویں کے ساکت پانی کی قصیدہ خوانی کرے۔ اس

نے کہنہ و پارینہ استعاروں میں موزوں تبدیلیوں کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ٹھیک ہے جب زُہیر نے تقدیرِ انسانی کو ایک اندھے اونٹ سے تشبیہ دی تھی تو اس وقت اس صنعت نے سامعین کو اپنی ندرت سے ضرور حیرت زدہ کیا تھا، لیکن مسلسل پانچ صدیوں کی حیرت زدگی نے تعجب کے منبع کو یک سر خشک کر دیا ہے۔ اس قول کو بھی حاضرین نے بہت پسند کیا۔ انھوں نے یہی بات اکثر سنی تھی، اور مختلف لوگوں سے سنی تھی۔ لیکن ابن رشد بالکل گم صم بیٹھا رہا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو، انتہائے کار، اس نے بولنا شروع کیا، لیکن محسوس ہوتا تھا وہ اوروں سے زیادہ خود اپنے لیے ہی بول رہا ہے:۹

’’قدرے کم فصاحت لیکن کم و بیش اسی قسم کے دلائل کے ساتھ خود میں بھی اس مقولے کا دفاع کر چکا ہوں جس کا اس وقت عبدالملک حامل ہے، اسکندریہ میں بھی یہ عقیدہ رائج ہے کہ ارتکابِ جرم سے دراصل وہی شخص معذور ہے جو ارتکابِ جرم اور بعد ازآں اس سے توبہ کر چکا ہو۔ علیٰ ہٰذاالقیاس، غلطی سے مبرّا ہونے کے معنا یہی ہیں کہ آدمی پہلے غلطی کرنے کا اقرار کرے۔ اپنے ’’مُعلّقے‘‘ میں زہیر کہتا ہے کہ دکھ اور عظمت سے مملو ان اَسّی برسوں میں اس نے بار ہا تقدیر کو اچانک کسی اندھے اونٹ کی طرح آدمی کو نہایت بے دردی سے کچلتے دیکھا ہے۔ عبدالملک کا خیال ہے کہ آج اس صنعتِ شعری میں تعجب خیزی کا کوئی عنصر باقی نہیں رہا ہے۔ اس اعتراض کے کئی جواب دیے جا سکتے ہیں: اوّل تو یہی کہ اگر کسی نظم کا واحد مقصد محض تعجب کو ابھارنا ہے تو اس نظم کی عمر کو، صدیاں رہیں ایک طرف، دنوں، بل کہ گھنٹوں، یا شاید لمحوں میں ناپا جا سکتا ہے۔ دوم، کوئی بھی نامی گرامی شاعر دراصل موجد کم اور دریافت کرنے والا زیادہ ہوتا ہے۔ برجہ کے ابنِ شرف کی تعریف میں کہا گیا ہے، اور بار بار کہا گیا ہے، کہ تنہا وہی یہ تصور کر سکتا تھا کہ سپیدۂ سحر کے وقت نجوم بے حد دھیمی رفتار سے گرتے ہیں، بالکل ایسے جیسے درخت سے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے ہوں۔ اوّل تو حقیقت یوں نہیں، اور اگر ہوتی بھی، یعنی ستاروں اور پتّیوں کے گرنے میں فی الواقع مطابقت پائی جاتی، تو بھی ایک شعری پیکر کی حیثیت سے یہ مطابقت بے وقعت ہی رہتی۔ ایسا پیکر [تشبیہ] جو صرف ایک ہی آدمی کی گرفت میں آ سکے، کسی طرح اوروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ روے زمین پر بے شمار اشیا پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی دوسری کے مساوی قرار دی جا سکتی ہے۔ ستاروں کو پتّیوں کا قریں بنانا سراسر دھندلی ہے، اور اتنی ہی بے اصولی بات جتنا ان کا موازنہ مچھلیوں اور پرندوں سے کرنا۔ اس کے برعکس، مشکل ہی سے کوئی آدمی ایسا ملے گا جس نے کبھی نہ کبھی یہ نہ محسوس کیا ہو کہ تقدیر نہایت شقی، بدقوارہ، اور پھوہڑ بھی ہوتی ہے، اور نہایت معصوم اور غیر انسانی بھی۔ اسی یقین کے ساتھ —— اور یہ یقین عارضی بھی ہو سکتا ہے اور مسلسل بھی، لیکن اس سے مفر کسی کو نہیں —— زہیر نے اپنا مذکورہ شعر کہا تھا۔ اور جو کچھ بھی اس نے کہا ہے وہ اس سے بہتر طریقے پر کبھی نہیں کہا جا سکے گا۔ علاوہ ازیں (اور جو میں اب کہنے والا ہوں وہ میری فکر کا نچوڑ ہے)، وقت جو قلعوں کو تہس نہس کر دیتا ہے، شعر کو مالا مال کر دیتا ہے، اس کی قدر و قیمت بڑھا دیتا ہے۔ جب زہیر نے عربی زبان میں یہ شعر کہا تو اس کے ذریعے دو پیکر ایک دوسرے کے عین مقابل آ کھڑے ہوے: ایک پیکر تو اندھے اونٹ کا تھا، اور دوسرا تقدیر کا۔ آج اس کا اعادہ نہ صرف زہیر کی یاد تازہ

کر دیتا ہے، بل کہ ہمارے رنج والم کو خود اس مردہ عرب شاعر کے رنج والم سے مدغم بھی۔ اس صنعت کی تب دو شقیں تھیں، آج چار ہو گئی ہیں۔ وقت شعر کی حدود کو پھیلا دیتا ہے۔ مجھے چند ایسے شعر بھی یاد ہیں جو موسیقی کی طرح تمام لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ تاثر رکھتے ہیں۔ مثلاً برسوں پہلے جب مجھے مراقش میں قرطبہ کی یادوں نے بے چین کر رکھا تھا، میں ان اشعار کو دہرانے میں، جو عبدالرحمٰن نے رُصافہ کے باغوں میں کسی افریقی کھجور کے درخت کو مخاطب کر کے کہے تھے، بڑی طمانیت، بڑی آسودگی محسوس کرتا تھا۔ وہ اشعار یوں شروع ہوتے ہیں:

تو بھی، اے کھجور کے درخت
اس ساحل پر اجنبی ہے . . .

اور دراصل یہی شعر کی عدیم المثال خوبی ہے، یعنی یہی کہ وہ الفاظ جو ایک بادشاہ نے مشرق کی آرزو میں کہے تھے، خود میری کیفیت کے غمّاز تھے جب میں افریقا میں جلاوطن، اندلس کی یاد میں تڑپ رہا تھا۔''[۱۰]

اس کے بعد ابن رشد نے شعرائے متقدّمین — یعنی اسلام کی آمد سے قبل دورِ جاہلی کے شعرا — کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ جو کچھ بھی شعر میں کہا جا سکتا تھا، یہ شعرا پہلے ہی کہہ آئے ہیں، اور وہ بھی ریگستانوں کی ازلی ابدی زبان میں۔ ابنِ شرف کے شوقِ نمائش سے چوکنّا ہوتے ہوئے — اور یہ بلا سبب نہ تھا — ابنِ رشد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ساری شاعری کا نچوڑ تو بس انھیں قدما کے یہاں اور قرآن میں بھی آ گیا ہے۔ پھر اس نے اختراع کی ہوس پر ملامت کی اور کہا کہ یہ نہ صرف ایک جاہلانہ حرکت ہے، بل کہ شیخی بازی سے بھی مملو ہے۔ دیگر مہمان نہایت لطف ونشاط کے ساتھ ابن رشد کے اقوال کو سنتے رہے، کیوں کہ وہ درحقیقت ان میں روایت کی حمایت پیش کر رہا تھا۔

جب ابن رشد دوبارہ اپنے کتب خانے میں داخل ہوا تو اس وقت موذّن ہر طرف مومنین کو نمازِ فجر کی دعوت دے رہے تھے۔ (حرم میں سیاہ زلفوں والی باندیاں ایک سرخ بالوں والی غلام لڑکی کو سخت اذیّت پہنچا رہی تھیں، لیکن ابنِ رشد کو دوپہر سے قبل اس واقعے کا علم نہ ہونے والا تھا۔) اُن دو خاصے مبہم الفاظ کا مفہوم اب کچھ کچھ ابن رشد پر واضح ہو گیا تھا۔ چناں چہ اس نے قلم اٹھا کر نہایت ٹھہرے ہوے اور محکم ہاتھ سے مسودّے میں مندرجہ ذیل سطور کا اضافہ کر دیا:

> ارسطو قصائد کو ''المیے'' کا نام دیتا ہے اور ہجویات اور تمام مذموم ومردود چیزوں کو ''طربیے'' کا۔ قرآن نہایت قابلِ ذکر المیوں اور طربیوں کا مجموعہ ہے، بالکل اسی طرح حرم کے ''معلّقات'' بھی ہیں۔[۱۱]

ابن رشد کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چلی تھیں، اور اس نے اپنے جسم کو قدرے خنک بھی محسوس کیا۔ سر سے پگڑی اتار کر اس نے ایک دھات کے بنے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے یہ علم نہیں کہ وہاں ان آنکھوں نے کیا دیکھا، اور یہ اس لیے کہ آج تک کسی بھی تاریخ داں نے اس کے خط وخال کا نقشا نہیں کھینچا ہے۔ البتّہ مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ ابن رشد چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ گویا بغیر شعلے کی آگ کا کوئی پُر شور کوندا اسے آناً فاناً نگل گیا ہو۔ اور ابن رشد کے ساتھ ساتھ وہ مکان، نظروں سے اوجھل فوّارہ، کتابیں، مسوّدے، فاختائیں، سیاہ زلفوں والی باندیاں اور سرخ بالوں والی لرزہ براندام غلام لڑکی، فرج، ابوالقاسم، گلاب کے پودے اور شاید دریاے وادی الکبیر — سب کے سب آنِ واحد میں غائب ہو گئے۔

مذکورہ بالا قصے میں، مَیں نے ایک شکست کی وقوع پذیری کے عمل کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے مجھے کینٹر بری کے اس پادری کا خیال آیا جو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کا مدّعی ہوا تھا۔ پھر ان کیمیا گروں تک خیال گیا جنھیں پارس پتّھر کی تلاش تھی۔ بعدازآں میں نے ان لوگوں کی بابت سوچا جو بے سود ہی زاویے کو تین برابر کے حصوں میں تقسیم کرنے اور دائرے کو مربّع کرنے چلے تھے۔ ان سب کے بعد میں نے سوچا تو مجھے اس شخص کا معاملہ نہایت ہی جاذب، شاعرانہ، اور مولک نظر آیا جو اپنا مطمحِ نظر ایسے مقصد کو بناتا ہے جس تک دوسروں کی رسائی تو ممکن ہوتی ہے لیکن خود اس کی اپنی نہیں۔ مجھے ابن رشد یاد آیا، وہ ابن رشد جو اسلام کے دائرے میں مقیّد ہونے کی بنا پر ''المیہ'' اور ''طربیہ'' جیسے الفاظ کی اہمیت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کہانی سنا دی۔ جوں جوں میں اس کہانی کے مختلف مدارج سے گزرتا گیا، مجھے بالکل وہی سب محسوس ہوا جو اس خدا کو محسوس ہوا ہوگا جو ایک مسخرے کہ بقول چلا تھا بَیل تخلیق کرنے اور بنا کر رکھ دی بھینس! مجھے ناگزیر طور پر محسوس ہوا کہ یہ فعل میرا مذاق اڑا رہا ہے، اور یہ بھی کہ بنا کبھی یہ جانے کہ تھیئٹر کیا ہوتا ہے، ابن رشد کا ڈرامے کا تصور کرنا اتنا ہی مہمل تھا جتنا میرا، رینان، لین، اور آسین پلاسیوس سے حاصل شدہ چند پراگندہ ٹکڑوں کے سہارے ابن رشد کا تصور کرنا۔ آخری صفحے تک پہنچتے پہنچتے مجھے یہ احساس بہ خوبی ہو گیا تھا کہ میرا بیانیہ اس آدمی کا علم تھا جو میں اس کو لکھنے کے دوران خود تھا، کہ اس کہانی کو لکھنے کے لیے میرا وہ آدمی بننا لازم تھا، اور یہ کہ ایسا آدمی بننے کے لیے میرے لیے اس کہانی کو لکھنا ضروری تھا۔ وَقِس علیٰ ہٰذا۔ (جس لمحے میرا ابن رشد پر سے اعتقاد اٹھنے لگتا ہے، ٹھیک اسی لمحے وہ زن سے غائب ہو جاتا ہے۔) [۱۲]

❁

[مطبوعہ، محمد عمر میمن، ''آوارگی: منتخب تراجم'' (کراچی: آج کی کتابیں، ۱۹۸۷)، ۲۰۹–۲۱۸]

<mumemon@charter.net>

[اس ترجمے کے حواشی کے لیے ملاحظہ کیجیے: محمد عمر میمن، ''بورخیس کا ابن رشد: توضیحات اور حواشی'']